مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی سے میری پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب میں طالب علمی کی غرض سے دیو بند حاضر ہوا۔ لیکن مفتی صاحب کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلقات اور روابط میری پیدائش (۱۹۰۸ء سے بھی پہلے سے تھے) اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب اور ان کے پھوپھا حافظ سید عنایت حسین صاحب یہ دونوں سرکاری ملازمت میں ہونے کے ناطے آگرہ میں، مع متعلقین کے رہتے تھے اور والد صاحب قبلہ کے ان دونوں بزرگوں سے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کے اہل خانہ ہمارے گھر آتے اور میری والدہ ماجدہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر ان کے گھر جاتیں اور بعض مرتبہ دو دو تین تین دن قیام رہتا۔ اور ہاں یاد آیا، مفتی صاحب کے ایک اور پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق تھے، وہ بھی آگرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ نہر تھے، والد صاحب کا ان سے بھی گہرا ربط و تعلق تھا، کم از کم ہفتہ میں ایک دن ملاقات ضرور ہوتی تھی جب والد صاحب اور یہ حضرات جمعہ کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں پڑھتے اور اس سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرہ میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر لطف صحبت و ملاقات اٹھاتے۔

ان رشتہ داریوں کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا

گاہے گاہے آگرہ آنا جانا رہتا اور مفتی صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوتے، حضرت مفتی صاحب جب کبھی آگرہ آتے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے اور والد صاحب قبلہ آپ کی بڑی شاندار دعوت کا اہتمام کرتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کی بڑی بہن عطیہ بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور میں ان کے اور چند خواتین کے ساتھ تاج محل دیکھنے گیا تھا، ایک مرتبہ مفتی صاحب سے آگرہ کا ذکر آیا تو بولے: اباجی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) (کا کشف قبور کا علم بہت بڑھا ہوا تھا) قیام آگرہ کے دنوں میں ایک روز بادشاہ اکبر کے مقبرہ سکندرہ تشریف لے گئے، تو قبر پہ پہنچتے ہی آپ کی حالت متغیر ہوگئی اور طبیعت پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی اور فرمایا: جلد چلو، عذاب الٰہی نازل ہو رہا ہے، اس کے برعکس تاج محل میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آپ آئے تو وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھی۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بھی سنایا: ایک مرتبہ اباجی میرے ماموں حافظ عبدالحی صاحب کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لے گئے، گھومتے پھرتے جمنا کی طرف جو فصیل ہے اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے، اس وقت فضا بڑی دلکش اور سہانی تھی، موسم نہ گرم نہ سرد بڑا خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی اور سبک و خنک ہوائیں موجزن ــــــ حافظ عبدالحی صاحب دراز قامت، گورے چٹے وجیہہ و مقبول صورت بزرگ تھے، سینہ چوڑا چکلا اور جسم ورزشی رکھتے تھے، عابد و زاہد اور نہایت متقی اور پرہیز گار اس درجہ کے تھے کہ کلکٹری میں سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی رشوت کا گھر میں آسکے، حافظ قرآن اعلیٰ درجہ کے تھے، قرآن سے ان کو عشق تھا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے، فن تجوید سے واقف تھے یا نہیں! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ان کی آواز میں اس درجہ درد اور لب و لہجہ میں اس غضب کا سوز و گداز تھا کہ سامعین پر ایک وجد اور سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا ــــــ مفتی صاحب کا بیان ہے: تاج محل کی اس ولولہ انگیز فضا میں بیٹھ کر اباجی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ) نے حافظ عبدالحی صاحب سے

قرآن مجید سنانے کی فرمائش کی، وہاں تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا، با وضو تو وہ ہر وقت رہتے اور سبحہ گردانی کرتے رہتے ہی تھے، فوراً سورۂ واقعہ شروع کردی، سورت کے مضامین اور ان کا وہ اسلوب اور آہنگ اور پھر حافظ صاحب کا وہ لحن داؤدی! اک سماں بندھ گیا۔ اباجی پر استغراق کا عالم دیر تک طاری رہا۔

حضرت مفتی صاحب کے علمِ کشف قبور کا ذکر ابھی آیا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سن لیجیے، ایک دن مفتی صاحب نے ذکر کیا: ایک مرتبہ اباجی مجھے ساتھ لے کر مدراس تشریف لے گئے جہاں آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ اس سفر میں ہم سرنگا پٹم بھی گئے، یہاں اباجی جب سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر پہنچے تو آپ بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب ہو کر ایصال ثواب کرتے رہے جب فارغ ہو کر اٹھے تو چہرہ پر بشاشت ونشاط کا عجیب عالم تھا اور فرمایا: اس مزار میں جو شخص دفن ہے، اللہ کے ہاں اسے شہادت کا بڑا اونچا مقام ملا ہے، رحمت باری کا نزول مسلسل ہو رہا ہے۔

بہرحال یہ تھی نوعیت ان تعلقات کی جو مفتی صاحب کے اور میرے خاندانوں میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے تھے۔

اب میرے ابتدائی حالات بھی سنیے تاکہ مجھ کو اکابر مشائخ وعلمائے دیوبند کے ساتھ اللہ کے فضل وکرم سے جو قرب واختصاص رہا ہے اس کا پس منظر آپ کے سامنے آسکے۔

اگرچہ میرا ددھیال بچھراویں ضلع مرادآباد اور ننھیال سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن والد ماجد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بسلسلۂ ملازمت سرکاری پہلے اتر پردیش کے مختلف شہروں میں ادھر ادھر رہے، پھر آخر میں آگرہ پہنچے تو یہاں ایسا جمے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں پر رہ پڑے، میری پیدائش آگرہ کی ہے اس لیے اکبرآبادی کہلاتا ہوں۔[1]

---

[1] میں پہلے نام کے ساتھ "اکبرآبادی" نہیں لکھتا تھا، یوں کبھی بھولے بسرے سے لکھ دیا ہوا اس کا اعتبار نہیں، چنانچہ میری تمام اسانیہ! ابتدائی تصنیفات اور خود برہان کے ٹائیٹل پیج پر صرف
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

والد صاحب آگرہ کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے اس لیے سرکاری تنخواہ کے علاوہ پرائیوٹ پریکٹس کی آمدنی بھی بہت معقول رکھتے اور بڑی فراخی اور کشادہ دستی سے گذر بسر کرتے تھے اور میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے رسم ورواج زمانہ کے مطابق انھیں چاہیے تھا کہ مجھ کو انگریزی تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے دوستوں میں مطعون ہوئے اور سارے آگرہ میں نکو بنے، مسٹر اختر عادل آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ تھے اور بعد میں پاکستان گورنمنٹ کے ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے، والد صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے خود میرے سامنے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیا سوجھی کہ لڑکے کو مُلّا بنا رہے ہیں، آپ اس کو انگریزی پڑھاتے ذہین بچہ ہے، بڑا اچھا بیرسٹر ہوتا، ڈاکٹر تصدق حسین آگرہ کے بڑے نامور ڈاکٹر تھے، ایک روز انھوں نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ سعید کو انگریزی پڑھوا کر میڈیکل ایجوکیشن میں بھیجے بڑا ہونہار لڑکا ہے، بہت کامیاب ڈاکٹر ہوتا، عربی پڑھ کرا سے کیا ملے گا! سید نیاز احمد صاحب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میرا نام درج ہے، لیکن ۱۹۴۸ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو میری کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے بارہ میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبرآبادی کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبرآبادی میرے نام کا جزو لاینفک ہو گیا، اس سلسلہ میں یہ ایک واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ ۱۹۶۳ء میں جب میں کناڈا سے نیویارک (امریکہ) گیا اور وہاں سے ایک دن کے لیے پرنسٹن یونیورسٹی بھی آیا تو جب میں یونیورسٹی کی لائبریری میں گھوم پھر رہا تھا اچانک لائبریرین میرے پاس آئے اور میری کتاب "فہم قرآن" کا جو نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "جناب! کیا اس کتاب کے مصنف آپ ہی ہیں" جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فوراً کتاب کی لوح پر میرے نام کے آگے اکبرآبادی کا لفظ بڑھا دیا تاکہ یہ Surname کی حیثیت سے مستعمل ہو۔

کوتوال شہر حضرت ریاض خیرآبادی کے برادر خورد اور خود بھی صاحب دیوان شاعر والد صاحب قبلہ کے جگری دوست تھے، ایک دن بولے: ابرار (والد صاحب کا نام) تمھارے پاس کمی کس چیز کی ہے، سعید کو انگریزی کی تعلیم دلاکر مقابلہ کے امتحان میں بٹھاتے بڑا اچھا ڈپٹی کلکٹر یا مجسٹریٹ ہوتا، یہ عربی تعلیم کس کام آئے گی" غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور فکر ہرکس بقدر ہمت اوست" ایسے موقعوں پر والد صاحب کا عام جواب یہ ہوتا: اللہ کا حکم اور مشیت ہی یہ ہے، اس کی مشیت کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے' لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آخر والد صاحب نے ایسی تعلیم کا فیصلہ کیوں کیا جس کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت نہیں تھی اور جو مولانا شبلی کے لفظوں میں "انچہ باہیچ نیرزد بجہاں" کا مصداق تھی!

ایک روز احباب خاص کی مجلس میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا:

"سعید میاں کی پیدائش سے پہلے میرے ایک لڑکی تھی، قمر النساء نام تھا۔ یہ بچی دس برس کی تھی کہ آگرہ میں طاعون پھیلا۔ خدا کی شان ہے اس مرض کے کتنے ہی بیمار میرے ہاتھوں اچھے ہوگئے تھے، لیکن خود میری اپنی بچی اس کا شکار ہوگئی، قمر کے بعد میرے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے اب کیا توقع ہوسکتی تھی، میرا جی دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور میں نے ہجرت کا یکا ارادہ کرلیا، لیکن اجازت طلبی کے لیے جب میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی عبدالغنی صاحب[1] منگلوری کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں ہجرت نہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لکھا:

---

[1] بچپن میں متعدد بار خاکسار کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت خوب مندرجت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل منگلوری جو مشہور عالم اور بزرگ تھے ان کے فرزند ارجمند تھے، شروع میں لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اچانک آپ میں انقلاب پیدا ہوا ایک کوٹھری میں بند ہوکر چالیس دن کا چلہ کھینچا جس میں جو کی دو ٹکیوں کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتے تھے، مقررہ مدت کے بعد چلہ سے باہر آئے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

تم گھبراؤ نہیں اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تم کو "فرزند سعید" عطا فرمائے گا۔ چنانچہ اس بشارت کے کئی برس بعد یہ بچہ پیدا ہوا؛ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہوا کہ اس بچہ کی ولادت سے دو تین گھنٹے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں، میں نے انھیں دیکھا تو سروقد کھڑا ہو گیا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا: حضرت تشریف رکھیے، ادھر سے ارشاد ہوا: "ڈاکٹر! فرزند سعید مبارک ہو، ہم بیٹھیں گے نہیں، اسی مبارک باد کی غرض سے آئے تھے" بس یہ فرمایا اور رخصت ہو گئے۔"

والد صاحب نے اس کے بعد فرمایا:

"پیر و مرشد کی بشارت اور پھر یہ خواب اور دونوں میں فرزند سعید کے الفاظ مشترک میں نے غور کیا تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ اشارہ غیبی ہے اس امر کی طرف کہ میں بچہ کا نام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو اب عالم ہی دوسرا تھا، جذب اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ نگاہوں میں عجیب کشش تھی، ان کے کشف اور کرامتوں کا چرچا عام تھا۔ مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں سرکاری افسروں اور امراء و روٴسا کی تھی، حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی بھی آپ کے جاں نثار مرید تھے، زندگی شاہانہ تھی، سات مشکی گھوڑے میں نے خود ان کے اصطبل میں گنے ہیں، بدعات کے سخت دشمن تھے، اتباع سنت پر ہمیشہ زور دیتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: تو میری دعاؤں سے پیدا ہوا ہے، اپنے باپ اور ماں کی طرح تو بھی میرا مرید ہو جا"۔ میں بزرگوں کی مجلس میں گستاخ ہمیشہ کا ہوں، فوراً عرض کیا: حضرت مجھ پر تو ابھی نماز بھی فرض نہیں ہے۔ والد صاحب اس گستاخی پر مجھے سرزنش کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت قاضی صاحب نے روک دیا اور ہنس کر فرمایا: شاباش! ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔

٭ ٭ ٭

سعید رکھوں اور دیوبند میں اسے عربی اور دینی تعلیم دلاؤں۔

جب والد صاحب قبلہ نے میری تعلیم کے بارہ میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا تو اب انھوں نے اس کا اہتمام بھی اس درجہ کیا کہ کوئی اولاد کی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا، میری بسم اللہ کے لیے حضرت قاضی صاحب کو منگلور لکھا تو آپ نے اسی مقصد کے لیے اپنے ایک عزیز میاں محمد افضل کو بھیج دیا۔ یہ اگرچہ عالم نہیں تھے، لیکن نیم مجذوب تھے اور مشہور تھا کہ مادر زاد ولی اور مستجاب الدعوات ہیں، اس کے بعد ایک حافظ اور ایک مولوی صاحب کا تقرر کر دیا گیا جن سے میں نے علی الترتیب قرآن مجید پڑھا اور اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اب عربی کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کو دیوبند لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی عربی تعلیم کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے، ازراہ کرم کسی اچھے عالم کا انتخاب کر کے بھیج دیجیے، تنخواہ معقول دوں گا، لیکن عالم کا متقی پرہیز گار ہونا ضروری ہے، کیونکہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ان کے سپرد ہوگی" دیوبند کے شیوخ میں سے ایک صاحب مولوی خورشید علی نام کے تھے، دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور آج کل دار الافتاء میں کام کر رہے تھے، عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، گورے چٹے اور نورانی شکل و صورت کے انسان تھے، حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا عبد الکریم صاحب سے بیعت تھے اس لیے اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں آگرہ بھیج دیا۔[1]

---

[1] مولوی خورشید علی صاحب کے والد مولوی فرزند علی دیوبند کے وکیل یا مختار تھے، دار العلوم دیوبند کا مکان جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رہتے تھے، در اصل انھیں مولوی فرزند علی کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب مولوی خورشید علی اس کے مالک ہوئے تو باپ چونکہ قرض بہت کافی چھوڑ گئے تھے اس لیے مولوی خورشید علی صاحب نے یہ مکان دار العلوم کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ کیا تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ موصوف ہمارے مکان (واقع لوہا منڈی) کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لے کر مع متعلقین کے رہتے اور اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، ان کے متعلقین میں ایک عمر سے ڈھلی ہوئی خوبصورت بیوی، دو جوان لڑکیاں، رضیہ اور فاطمہ اور ایک جوان لڑکا حسن۔ اس طرح لے دے کے کل پانچ آدمیوں کا یہ کنبہ تھا، میں وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ کا مصداق تھا، اس لیے پردہ گردہ کسی سے نہیں تھا، بے تکلف گھر میں آنا جانا تھا۔

والد صاحب قبلہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ صرف فارسی اور عربی کی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اور اہم مضامین کی تعلیم بھی ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے میرے لیے ایک قابل ہندو گریجویٹ، مسٹر مکٹ بہاری لال ماسٹر کا بھی تقرر کیا اور اب پروگرام یہ ہو گیا کہ صبح چار گھنٹے مولوی خورشید علی صاحب مجھ کو عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم دیں گے اور شام کو دو گھنٹے ماسٹر صاحب انگریزی، حساب اور تاریخ و جغرافیہ پڑھائیں گے، مولوی صاحب کے سپرد یہ کام بھی تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، مسجد میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جائیں گے اور صبح شام کی ہواخوری میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی خورشید علی صاحب محبت اور توجہ سے پڑھاتے تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ان کو تصوف کا بڑا ذوق تھا، مثنوی مولانا روم کے عاشق تھے۔ اس لیے اکثر بزرگان اور اولیائے کرام کے قصے سناتے اور قرآن مجید کے احکام کی حکمتیں بیان کرتے رہتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دین کی عظمت اور بزرگان دین کی محبت بچپن میں ہی دل میں بیٹھ گئی اور اتالیق رکھنے سے دراصل والد صاحب کا مقصد بھی یہی تھا، میری عربی کی تعلیم کافیہ تک ہوئی تھی کہ مولوی خورشید علی صاحب چلے گئے اور ان کی جگہ دیوبند سے ہی مولوی غلام نور صاحب آئے جو سرحدی اور نہایت قابل آدمی تھے، وہ ہمارے ہاں نو دس ماہ رہے ہوں گے لیکن اس مدت میں مشق و تمرین کے ذریعہ انھوں نے صرف و نحو کے قواعد دماغ میں

کالنقش فی الحجر کرادیے جس کا اثر میں اب تک محسوس کرتا ہوں اور چونکہ مشق و تمرین کے لیے مولوی صاحب سب مثالیں قرآن مجید سے لیتے تھے اس لیے ابتدا ہی میں قرآن مجید سے مناسبت اور کچھ شدید پیدا ہوگئی، علاوہ ازیں مجھ کو نحو ایسے خشک اور بے مزہ فن سے ایسی دلچسپی ہوگئی کہ بعد میں کتاب سیبویہ اور النحو الوافی کا مطالعہ میں نے خود اپنے شوق سے کیا۔

کم وبیش چار برس تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کافیہ، قدوری وغیرہ تک پڑھ چکا تھا اس کے بعد والد صاحب نے میری انگریزی تعلیم موقوف کردی کیونکہ اب دونوں قسم کی تعلیم ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مقصد اصل عربی تعلیم کی تکمیل تھا۔ علاوہ ازیں اب والد صاحب نے مجھ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ بھی کرلیا، چنانچہ مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کردیا گیا۔ مراد آباد میں میرے اعزا و اقربا کافی تعداد میں تھے، لیکن والد صاحب نے کسی کے مکان پر میرے تنہا رہنے کو پسند نہیں فرمایا، ایک مکان کرایہ پر لیا اور دونوکروں کے ساتھ میری والدہ اور ہمشیرہ خورد کو بھی میری خاطر مراد آباد بھیج دیا، مدرسۂ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری تھے اور مدرس مولوی محمد اسحاق صاحب کانپوری اور مولوی محمد حنیف صاحب امروہوی تھے، میری کتابیں شرح جامی، شرح وقایہ وغیرہما ان تینوں حضرات کے پاس تھیں، تعلیمی سال کے ختم پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری امدادیہ مدرسہ چھوڑ دارالعلوم دیوبند آگئے تو اب والد صاحب نے مجھ کو بھی دیوبند بھیجنے کا ارادہ فرمالیا، یہ غالباً ۱۹۲۱ء یا ۲۲ء کی بات ہے۔

لیکن والد صاحب نے جو اہتمام مراد آباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا، مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب مرحوم ومغفور آگرہ کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر دیوبند میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، یہاں محلہ شاہ ابوالمعالی میں ان کا ایک ذاتی مکان تھا اس میں رہتے تھے، اسی مکان کی بغل میں حافظ صاحب کا ایک اور مکان تھا، والد صاحب نے یہ مکان جس کا اصل دروازہ بھی پہلے مکان کے اندر ہی تھا حافظ صاحب سے کرایہ پر

لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دو نوکروں کے اس گھر میں منتقل کر دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آ گئے، میں نے اگر شروع میں کہا ہے کہ والد صاحب قبلہ نے میری عربی تعلیم کا اہتمام اتنا کیا کہ کوئی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا۔ تو فرمائیے میں نے کیا غلط کہا۔ والد صاحب کی پریکٹس کی آمدنی کا اوسط اگر کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی مان لیا جائے تو چھ مہینے کی رخصت کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے چھ ہزار کا نقصان کیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے والد صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرنے، والد صاحب نے جواب دیا: حضرت! بچہ بہت لاڈ اور پیار کا پالا ہوا ہے، کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں ہے اس لیے مہربانی فرما کر صرف ایک برس کی اجازت دے دیجیے، بات رفت گذشت ہوئی، دارالعلوم میں میرا داخلہ ہو گیا، اور میں پورے گھر کے ساتھ محلہ شاہ ابو المعالی میں رہنے لگا۔

مفتی صاحب کے اور میرے تعلق کی داستان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر عصر کی نماز کے بعد اپنی بہنو یعنی حافظ عبد الحی صاحب مرحوم کے گھر تشریف لاتے تھے اور مفتی صاحب، آپ کے فرزند اکبر آپ کے ہمراہ ہوتے، ہمارا مکان بغل میں تو تھا ہی، وہاں سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب ہمارے گھر آتے اور کچھ دیر والد صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ والد صاحب سخت بیمار ہو گئے، اور علالت کا سلسلہ طویل ہو گیا جس کے باعث ہم سب لوگ سخت پریشان تھے، اس زمانہ میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پابندی سے ہمارے گھر آتے اور والد صاحب پر کچھ پڑھ پڑھ کے دم کرتے رہتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص اور ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس روز والد صاحب کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور ہم لوگ سخت پریشان اور فکر مند تھے کہ اگر رخصت کے ختم ہونے تک والد صاحب شفایاب نہ ہوئے تو ان کی سرکاری ملازمت کا کیا ہوگا۔

اس کے دو دن پہلے اچانک خود بخود ایسے صحت یاب ہوئے کہ گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

مجھ میں اور مفتی صاحب میں فاصلہ بہت کافی تھا، کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے سات برس بڑے، میں متوسطات کا طالب علم اور وہ معین المدرسین۔

اس قدرتی فاصلہ کے باعث شروع شروع میں میرے اور ان کے درمیان یک گونہ حجاب سا رہا لیکن مفتی صاحب کی روزانہ آمد ورفت اور غیر معمولی توجہ اور کرم نے مجھ کو جلد بے تکلف بنا دیا۔

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

وقت گذرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہو گیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدۂ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجر میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) نے مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب اور میرے درمیان سن وسال اور مرتبۂ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برادرِ بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برادرِ خورد جانتے تھے، لیکن ایسا برادر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا: بھائی بہتر ہوتا ہے یا دوست؟ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو، اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لئے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک برس والدہ صاحبہ وغیرہا کے ساتھ محلہ ابوالمعالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔ اس کے

بعد میں نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی بغل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے میرے لئے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی اور دوسری جانب مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلۂ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دور اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلبا سے خلا ملا بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دور ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا، میں نے طلبا کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کے ہاں ان کی بیٹھک میں روزانہ مغرب سے عشار تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمودیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشار کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے، حضرت! یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تقریر کے ایک جز کو رٹ لیتے ہیں اور جلسہ

میں آکر اسے اُگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے، پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بُری نہیں، اچھی ہے، کیونکہ اس طرح ایک نامور ادیب وخطیب کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر میں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحبِ طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہیئے، یہ بات تو ختم ہو گئی، لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنجی ہے، اب فرض کرو تمھارے پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنجی تمھارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنجی تمھارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمھارے لئے بھی کار آمد ہوگا اور دوسروں کے لئے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہو گیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل وکمالات اور خاص عادات واطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ ومعائنہ کا موقع تو ملا ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید ومستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگر انتہائی عارفانہ زندگی کے احوال وشئون کے براہ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی مرتبہ ومقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کر سکتا ہے، البتہ جو بات میں اپنے علم ویقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر و درویشی جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے

سرمایۂ فخر فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب وعجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم اور شیخ کامل تھے، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چپراسی اور خدّام بھی کم نہیں تھے، لیکن باایںہمہ صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے تھے اور بازار جاتے وقت آس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ انھیں کچھ منگانا ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و توجہات عالیہ سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آیندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنئے، ایک مرتبہ حضرتِ موصوف مفتی صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیل گاڑی کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہونچے اور اپنے ایک مرید یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے ذرا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم سرما کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا اچار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو وہ کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا مسکراتے ہوئے آنکھوں کی ایک خاص گردش اور معصومانہ لب ولہجہ کے ساتھ اس کا اظہار اس بلیغ انداز میں کرتے تھے کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے کے بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ چوکنے والے کہاں تھے، بولے: ابا جی! کیا تذکیۂ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا ساگ کھانا بھی ہے؟ حضرتِ مفتی صاحب کو ہنسی آ گئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فرمایا:

میاں عتیق! کھا کے تو دیکھو، کیا مزے کی چیز اور جاڑوں کا تحفہ ہے، پھر حضرت مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: تمھاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا: حضرت! سبحان اللہ، یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص چپڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی میں بگھرا ہوا۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب! حضرت مفتی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا: اصل مقام شکر ایسی ہی چیزیں ہیں جن کو عرف عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انسان کا اپنے متعلق اعتراف ہیچ میرزی بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سا لگ گیا، ارشاد ہوا: یوں تو میں امیروں اور دولت مندوں کے ہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی، مفتی صاحب پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا: جلیل (قاری جلیل الرحمٰن صاحب، مفتی صاحب کے برادر خورد) کو ساتھ لے جائیے، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا جاتا۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دار العلوم کے دور ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے

فرزند ارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دار العلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دار العلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دار العلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچا زاد بھائی جو ان کی پھوپی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوئے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[1] مفتی صاحب اور مرحوم میں رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث

---

[1] عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں، جب کہ اس کے اڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

بہت گہرا ربط و تعلق تھا، وہ اول درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوق شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:
"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق" یا "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی نچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جزاست فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اردو شعراء میں غالب کی عظمت فکر خیال اور اس کے تیکھے اندازِ بیان کے معترف تھے لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک تغزل میں مومن کا مرتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ مومن میں جو سوز و گداز اور خود سپردگی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی انانیت اور خود پرستی کی وجہ سے مفقود ہے۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ دیکھئے غالب کا ایک شعر ہے:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس کے بالمقابل اب مومن کا شعر دیکھیئے ۔ کہتے ہیں:

اس نقشِ پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں مومن کی یہ غزل سنائی جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ آنکھ سے　　اجزائے دل کا نہ حال نہ پوچھ اضطراب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع　　مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے ۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی نہیں بلکہ خود غالب بھی مومن کے قائل تھے اسی وجہ سے تو جب انھوں نے مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنا تو غالب پھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کے لئے تیار ہوں غرضیکہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکرے ہوتے تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوقِ شعر و ادب کے جوہر دکھاتے رہتے تھے جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

دور جدید کے اردو شعراء میں حسرت موہانی، مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مداح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!
بے زبانی ـــ ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی
اے جفاکار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانہ سے

انھوں نے ان کو اتنی بار پڑھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہوگئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمھیں حسرت کا کونسا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حُسن کی بے شعوری

بولے: اوہو ہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریک خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کراچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کراچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فربہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا، چہرہ پر چیچک کے نشان، ڈاڑھی گنجان، آنکھیں درخشاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچیلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوار پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آگیا اور ہم نے ایک مکلف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آگیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آیئے جناب ناشتہ کر لیجیے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے، اب گفتگو شروع ہوئی:

ہم : جناب کہاں جا رہے ہیں ؟

وہ : (خنخناتی آواز میں) جی ! میں کراچی جا رہا ہوں۔

اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا : کیا آپ بتا سکتے ہیں کیوں"

وہ : وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم : جناب کا اسم گرامی !

وہ : فضل الحسن میرا نام ہے۔

میں : (اشتیاق دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں !

وہ : اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

یہ سن کر ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا : آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیۃ الطلبا کے عہدہ دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فرداً فرداً دوبارہ مصافحہ کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض کیا : حضرت ! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمائیے، مولانا نے فوراً سنانا شروع کر دیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے :

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے : علاوہ شعر و شاعری کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پر لطف ہوتی تھی۔

مجھے "بڑے بھائیوں" کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگرہ آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی مشفقانہ توجہ اب میری طرف زیادہ ہوگئی تھی ان کا ایک والانامہ والد صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا جس میں تحریر تھا: "سعید دیوبند کے محلہ بڑے بھائیوں میں رہتا ہے وہاں اس کی صحبت قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لئے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں" والد صاحب نے جواب دیا: "آپ نے بجا فرمایا میں تعمیل ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلاشرکتِ غیرے دے دیں اور نیز آپ اس کو براہ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں"۔ مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالاہتمام میں جانے کے لیے جو زینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھ میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جو اس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شعری و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذۂ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا

سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جمتی تھی جو اپنے اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعامی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے ....

ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی رح، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب 'طباخ' بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مرغ کا اسٹو پکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لئے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے۔ اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لئے وہ کبھی مرغابی یا تیتر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتا میں فتوی نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر ہر علم و فن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر و خطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گنجلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور درس بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب

کو خود بھی اپنی بلند آوازی پر ہنسی آتی تھی، ایک دن ہنستے ہنستے سنانے لگے: ایک مرتبہ جامع ازہر، مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درس گاہ میں بھی آگئے، میں اس وقت سلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور درس شروع کر دیا اور جب گھنٹہ بجا اور درس ختم ہو گیا تو موصوف مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے: "یا استاذ واللہ انک لرجلٌ فاضل، ولکنک تجہر جہیر البرق اخاف انک ستکون حماراً" مفتی صاحب یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنسی آگئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقل ودل ہونا چاہیئے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لئے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہیئے جس میں صرف چھنی چھنائی بات کا ذکر ہو، مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "ہاں اب تم کو فتویٰ لکھنا آگیا۔"

نیشنلزم یعنی قوم پروری اور اخلاص وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب

کو پایا ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبا کا ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون "سودیشی کی ضرورت" شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون از اول تا آخر پڑھا، مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پرزور اور شگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے عملی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس زمانہ میں بھی جبکہ دارالعلوم کے "شہزادے" یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ململ، چکن کے کرتوں اور جاپانی ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے ــــ مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کرتہ جو زیادہ لانبا نہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ چوڑے پائینچوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کرتہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی عمر بھر ان کا لباس یہی رہا، شیروانی پہنتے تھے اگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضعدار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۱۳۴۵ھ) میں خود دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمہارے لیے وہ تقریر لکھتا رہوں گا، چنانچہ انھوں نے دو موٹی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرز جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۱۹۴۷ء میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں؛

کر دیا سوق کے نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی بھی شروع سے ہی جذبۂ استخلاص وطن و قوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی و قومی مسائل و معاملات میں دونوں کے افکار و نظریات میں بڑی ہم آہنگی و یک جہتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ مولانا بڑے فعال و متحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹے کی دوستی تھی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مکی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمن، مولانا بدر عالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے، لیکن جہری نماز میں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آواز میں لوچ اور ہلکا ہلکا سا درد بھی غضب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ سنیے:

۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس

کرنے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لئے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا حسب معمول بڑے تپاک، اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو مولانا کے ملازم احمدؔ نے وہیں ڈرائنگ روم میں جا نمازیں بچھادیں، مولانا اور ہم باوضو تھے ہی، سیدھے مُصلّے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۂ القارعہ اور سورۂ الہٰکم التکاثر اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع وخضوع سے، اس کے بعد صوفہ پر بیٹھ گئے، آنکھیں بند کرلیں، ایک اونی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپا لیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: "مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پر اثر نہ ہو گا، اللہ جل شانہٗ کا آپ پر بڑا فضل وکرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرارت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چاروں نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھتا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھرتے ہی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: "حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو" جب دعا ختم ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے

کہا: "تھانہ بھون" کیوں؟ حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا، "حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے" طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف علی کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعہ ذیل سے ہوگی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گردن جھکالی تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی، .... اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا: "میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچا اور تمھارا عینی مشاہدہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔" یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے ـــــ اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے ـــــ تو آج میرے دل کی ایک پرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفری وفد تھانہ بھون پہونچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے

تین نام منظور ہوئے : (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۲) مولانا احمد سعید دہلوی اور (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہونچے اور تین روز تک وہاں مقیم رہے ، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے ، دراصل سنانا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا ، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کون ہو ؟ اس نے کہا : حضرت ! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں ، حضرت سے استفادۂ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں ، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے ، یہ شخص بولا : جی نہیں ، اس پر مولانا نے برہم ہو کر کہا کہ تم اٹھ جاؤ ، مگر وہ نہیں اٹھا ، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا ، اس پر مولانا کے پاس ایک رسّی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا رہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا ، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا ۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہو سکتے ۔

اس واقعے کو سنانے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب و غریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا واقعہ جو سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کرام خلق خدا کے لیے سراپا رحم و کرم اور مجسمہ شفقت و محبت ہوتے تھے ، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا ، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا دار و گیر کا

ضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسترشدین کے لیے خاص خاص شرائط اور ضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان شرائط وضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ موردعتاب بنتا تھا، اس فرق کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر لفظ صوفی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں نہ صوفی ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلّم اور مصلح ہوں، جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس کے لیے اصلاح وتربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت معلّم ومصلح اصلاح نفس، اصلاح عقائد، اصلاح معاملات ورسوم اور اصلاح عبادات واخلاق کے سلسلے میں جو نہایت عظیم الشان علمی اور عملی کارنامے انجام دئے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اس صدی کا مجدد بے تکلف کہا جاسکتا ہے اس بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کو صرف ایک لفظی اصطلاح کا فرق سمجھنا چاہیے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں ان کے کردار اور معیار کے مطابق نمبر جلد شائع ہونے جا رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب برہان کی طویل علالت کی وجہ سے اس میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں مضامین بلا تاخیر بھیجئے اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کے لیئے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

منیجر رسالہ برہان
عمید الرحمٰن عثمانی